مسلمانانِ ہند کے عہدِ زوال میں سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی خدمات

(Reform Services of Syed Aḥmad Shahīd during declination
of Muslims in Sub-continent)

*ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی

ABSTRACT

Reason of sending Prophets is to call upon the people towards message of Allah (S.W.T) which is the utmost virtue in Islam .In this regard holy Prophet was the last Messenger who preached and called people towards Allah. The Companions also devoted their lives for promotion and implementation of this noble cause. As result Islam spread over the Arabian Peninsula.

This mission of "Dawah" and reforms continued till now and scholars devoted themselves for the continuity of this mission effectively and consistently. This research paper gives a precise overview of the services rendered by the Syed Ahmed Shaheed for the Muslims of subcontinent in terms of social and moral reforms. The descriptive and analytical method has been employed for the collection and analysis of data. Literature review gives a picture that when Muslims of subcontinent abandoned true teachings of Islam, Syed Ahmed through his dedicated role brought positive change in the social and religious framework even in the period of decline. Facts about o life history of Syed Ahmed Shaheed also indicates the fact that a man can get achievement in every field of life, especially in "Dawah" and reforms, if he has courage and firm faith in Allah (S.W.T). Study suggests that servings of Syed Ahmed Shaheed should be brought up individually, collectively and even to Government level, so that new generation can get inspiration and motivation from such historical heroes of Islam who continued true message of Prophet (SAW) even in the time of decline.

Key Words: *Dawah, Reforms, Islam, Sunnah, Subcontinent*

مذہب اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی تعلیمات نہ صرف کامل واکمل ہیں بلکہ تغیر زمان و مکان کے باوجود معاشرے کو ساتھ لے کر چلنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس دین کو دوام اور ابدیت حاصل ہے جس کی بنیاد پر یہ چودہ سو سالوں سے انسانیت کی رہنمائی کر رہا ہے۔اس دین کی منبعِ تعلیمات،مامون و مصئون کتاب قرآن

---

* لیکچرار، شعبہ علومِ اسلامیہ، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

حکیم ہے جو اپنے وقتِ نزول سے لیکر تا ابد انسانیت کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس کے اولین شارح جناب نبی کریم ﷺ ہیں اور آپ ﷺ کے بعد یہ سہرا بزبان رسالت علماء کے سَر ہے۔ مشیت ایزدی نے ہر دور اور ہر زمانے میں علماء حق کی ایسی جماعت رکھی، جس نے وراثت نبوی کو دل و جاں سے عزیز رکھا اور دینِ محمدی کا نہ صرف پرچار کیا بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ جب کبھی دین متین میں سستی، کاہلی، نیز پیوند کاری اور ناروا تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اس کے قلع قمع کے لئے ہمیشہ صف اول کے سپاہی نظر آئے۔ سید احمد شہیدؒ اسی جماعت کے ایک نابغہ روزگار تھے جنہوں نے تیرہویں صدی میں مسلم امّہ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عہد زوال میں اصلاح امت کا فریضہ سرانجام دیا۔ یہ وہ دور تھا جب عوام الناس میں دین سے دوری عام تھی، ادیان باطلہ کی آمیزش نے دینِ محمدی کی خوبصورت تعلیمات پر نقاب ڈال دیا تھا اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے چرچے زبان زدِ عام تھے۔ ان حالات میں سید احمد شہیدؒ نے مسلمانانِ ہند کے درد کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کیلئے وہ ہمہ گیر تحریک چلائی جس نے برصغیر پاک وہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس مقالے میں آپکی انہی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کا جائزہ ذیل کی تین مباحث میں لیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے امید واثق ہے کہ وہ اسے اپنی رضا کی خاطر شرف قبولیت عطا فرمائیں گے۔

مبحث اول: مغلیہ سلطنت کا زوال اور مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالت

مبحث دوم: سید احمد شہیدؒ کے مختصر حالات زندگی

مبحث سوم: سید احمد شہید کی اصلاحی خدمات اور محققانہ تجزیہ

مبحث اول: مغلیہ سلطنت کا زوال اور مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالت

کسی بھی تحریک کا تحقیقی جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ زمانہء تحریک کے خدوخال اور اس سے وابستہ تمام اقسام کے مدوجزر کو اچھے طریقے سے جانا جائے وگرنہ کماحقہ حالات سے آگاہی کبھی نہیں ہوسکتی اور بجائے درست نتائج کے، غلط حقیقتیں ہی مقدر بنتی۔ ذیل میں ہم حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے قبل کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات کا طائرانہ مطالعہ کریں گے۔

مسلمانوں کی سیاسی حالت

مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ ویسے تو ان کے اندرونی خلفشار، جوڑ توڑ، نا اتفاقی و ناچاقی، دنیاوی حرص و لالچ اور ان سب سے بڑھ کر عیش، سرور اور موج مستی کی بنیاد پر دھیرے دھیرے بکھر رہا تھا لیکن خارجی طور پر جو قوم نہایت منصوبہ بندی سے ان پر غالب آئی وہ انگریز تھے جو برصغیر میں بطور تاجر داخل ہوئے۔ 1638ء میں انگریز ڈاکٹر بائن یا ڈاکٹر ہملٹن کے علاج سے شہزادی کے صحت یاب ہونے پر ان کا ٹیکس معاف کر دیا گیا۔ 1640ء میں دکن کے حاکم رام راجا کے بھائی نے مدراس انگریزوں کو دے دیا، جہاں سینٹ جارج نامی قلعہ بنایا گیا۔ 1685ء میں عالمگیر نے انگریزوں

کی بُری نیت کو بھانپ لیا اور پورے ہندوستان سے ان کو بے دخل کر دیا لیکن 1696 میں بادشاہ عظیم الشان نے ان کو پھر اجازت دے دی اور انھوں نے کلکتہ خرید لیا[1]۔ خریدارئ ہند کا سلسلہ یونہی بڑھتا رہا یہاں تک کہ ۱۱۷۹ھ بمطابق ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار، اڑیسہ کے صوبہ جات بلاشرکتِ غیر سرکار کمپنی کو دے دیئے گئے[2]۔ سید صاحب ؒ کی ولادت سے ۲۲سال قبل سرکار بنارس اور غازی پور بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے۔ سلطنت تیموریہ کے چشم وچراغ شاہ عالم کے قبضے میں صرف الٰہ آباد تھا اور خزانے میں وہ روپیہ جو انگریز بطور خیرات اس کو دیتے تھے۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر شاہ روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اور سخت ذلیل کیا[3]۔ ۱۲۰۸ھ بمطابق ۱۸۰۳ء میں ملکہ زبدۃ النساء کے مشورے اور شاہ دلی کی دعوت پر لارڈ لیک اپنی فوج کے ساتھ دلی میں داخل ہوا، مرہٹوں کو نکال باہر کیا اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سالانہ کر دی[4]۔ شاہ عالم اور اس کے جانشین اکبر شاہ نے بقیہ پوری زندگی وظیفہ خوری پر نہایت بااطاعت رئیس کے طور پر گزاری جسے امور سلطنت میں دخل دینے کی قطعا اجازت نہ تھی۔ اس عہد زوال میں بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دہلی سے دکن تک سب کچھ مرہٹوں کے رحم وکرم پر آگیا۔ پنجاب سے افغانستان تک سکھ قابض ہوئے جن کی دستبرد سے شمالی اور وسطی ہند بھی محفوظ نہ رہا[5]۔

مسلمانوں کی مذہبی حالت

مسلمانوں کے عہد زوال میں جب وہ سیاسی طور پر تنزلی کا شکار تھے تو مذہبی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں میں شرک پرستی موجود تھی۔ قبروں اور مردوں سے نذرونیاز، منت، مراد، عرس، تہوار، گانا ومیلہ لگانا، چراغِ مزاراں عام تھا۔ عورتوں کا مزارات پر جمع ہونا بھی کچھ معیوب نہ تھا۔ اسلامی شعائر کا خاتمہ اور ہندوانہ شعائر جنم لے رہے تھے اور انہی کو سَلام تھا۔ حلال کو حرام کرنا اور حرام کو حلال کرنا بھی جاری تھا۔ قرآن و حدیث کے بہت سے احکام مثلا بیوہ کا نکاح، وراثت کی تقسیم متروک العمل تھے۔[6] بدعات کا چرچا تھا اور سب سے بڑھ کر پیر کی سفارش علماءوعوام سب کے لئے کافی ومانند تِریاق تھی۔ شعائر اسلام کا خاتمہ نہ صرف امراءِ عوام بلکہ علماء کے شریعت کدے سے بھی ہو گیا تھا۔ سلام کرنے کی سنت ادا کرنے کی بجائے آداب وتسلیمات کا رواج تھا۔ اس سنت سے اتنا بُعد تھا کہ عالمگیر جیسا متشرع عالمِ دین بھی اس کی زَد میں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شیخ نے جامع مسجد کے زینے پر بادشاہ کے نزدیک آکر السلام علیکم کہا تو حکم دیا گیا کہ کوتوال کے حوالے کر دیا جائے۔[7]

مسلمانوں کی اخلاقی حالت

تیرہویں صدی ہجری مسلمانوں کا عہد زوال تھا اور مسلمانوں کی حالت وہی تھی جو کہ ایک زوال شدہ قوم کی ہوا کرتی ہے۔اس عالم میں فسق وفجور اور معصیت خداوندی نہ صرف عام بلکہ قابل فخر گردانی جاتی تھی ۔شراب نوشی کی لَت عام تھی اور نہ صرف ہر فرد کے اخلاق کے جوہر پر ضرب کاری لگ رہی تھی بلکہ وہ چھریرے بدن جو میدان ِجنگ کی شمشیر ہوا کرتے تھے،شراب نوشی کی بیماری کی زد میں تھے۔بازاری عورتوں کی اہمیت عنقاء سے کم نہ تھی۔ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ادب،فصاحت وبلاغت،تلمیح و اشارات،تصریح وکنایات،محاورات واصطلاحات کے دبیز ریشم کا مرقع تھا۔پستی کا عالم یہ تھا کہ امراء و شرفاءاپنے فرزندان کو ادب کے اسرارورموز سے واقفیت کے لئے انہی زنان ِتہی دامنِ اخلاق کے پاس بھیجا کرتے تھے جن کی تحریر وانشاءاور اخلاق وعادات سے سب رنگین تھے[8]۔دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت، جو اس زمانے میں تھی ،شرم وحیاءہاتھ جوڑے،آنکھیں نیچے کئے،نہایت شرمسار نظرآتی تھی۔یہ وہ وقت تھا جب نکاح صرف اپنے الفاظ کے ساتھ باقی تھا،عملی زندگی میں اسے دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔تعدادِ نکاح بلکہ ضرورتِ نکاح سے استغناء عام تھا[9]۔امراء سے لے کر غرباء تک عیش وعشرت کے مے کدے میں مست تھے،باوجودیکہ مسلمانوں پر یہ گھڑی سب سے نازک تھی کہ ان کا دینی واخلاقی دیوالیہ تو نکل ہی چکا تھا،سیاسی ومعاشی تابوت بھی بس آخری مراحل میں تھا لیکن عیش وعشرت کی نوازشوں نے اُن کی اس فکر کو بحر ہند میں غرق کر کے انہیں سامان فرحت میسر کر دیا تھا۔اخلاقی پستی کی اس سے بڑھ کر مثال کیا ہوگی کہ ابھی انگریزوں کو ہندوستان میں وہ تسلط حاصل نہ ہوا تھا جو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا،تاہم مسلمان عورتیں کسی بڑی آفت سے قبل ہی حرم فرنگی کی زینت بن چکی تھیں[10]۔

تیرہویں صدی ہجری کے مشاہیر

سابقہ حالات سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ تیرہویں صدی کا یہ زمانہ بالکل دورِ ظلمت تھا جہاں ہر طرف خاک اڑرہی تھی،دل ودماغ کے سوتے بالکل خشک ہوچکے تھے،مسجدیں،مدرسے اور خانقاہیں ویران تھیں بلکہ یہ صدی جہاں عہد زوال ہے وہیں علمی وروحانی اعتبارسے وہ زمانہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔یہ تیرہویں صدی ہی ہے جسے سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور بیہقیِ وقت قاضی ثناءاللہ پانی پتی،ترجمان القرآن شاہ عبد القادر دہلویؒ،مسندِ ہند شاہ اسحٰق دہلویؒ رونقیں بخش رہے تھے۔فن ریاضی وہیئت میں نواب تفضل حسین خان اور شمس الامراء نواب فخر الدین حیدرآبادی اس دور کے نابغہ روزگار تھے۔[11]اسی زمانے کے مشاہیر میں سے ایک حضرت سید احمد شہید تھے جنہوں نے تیرہویں صدی کے اس عہدزوال میں اصلاح وتجدید امت کا فریضہ سرانجام دیا۔آپ کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتاہے:

مبحث دوم: سید احمد شہیدؒ کے مختصر حالات زندگی

نام و نسب

سید احمد شہید ۶ صفر ۱۲۰۱ ھ بمطابق ۲ نومبر ۱۷۸۶ ء میں لکھنو سے ۹۶ میل دور ایک قصبہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اسی بناء پر آپ کو بریلوی کہا جاتا ہے۔ آپؒ کا خاندان محمد ذوالنفس الزکیہ شہیدؒ کی بارہویں پشت میں سید رشید الدین کے فرزند ارجمند سید قطب الدین محمد الحسنیؒ سے تعلق رکھتا ہے جو ۶۰۷ھ میں افغانستان سے براستہ غزنی دہلی تشریف لائے اور ایک مدت تک شیخ الاسلام کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کے جد امجد شاہ علم اللہؒ، مجدد الف ثانی کے خلیفہ اعظم، حضرت آدم بنوریؒ کے اولا مرید ہوئے پھر انہیں خلعتِ خلافت سے سرفراز کیا گیا۔ آپ نے ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر کے عہد میں وفات پائی۔ شاہ علم اللہؒ کے چار صاحبزادے تھے جن میں ایک سید محمد ہدیٰ اور ان کے صاحبزادے سید محمد نور جو حضرت سید احمد شہید ؒ کے بزرگوں میں سے ایک تھے۔ سید محمد نور کے دو صاحبزادے ہوئے سید نعمان اور سید عرفان۔ آپؒ سید عرفانؒ کے فرزند ارجمند ہیں۔ یوں آپ ؒ کا شجرہ کچھ اس طرح سے ہے، احمد بن عرفان بن سید محمد نور بن سید محمد ہدیٰ بن سید علم اللہ ۔ یہ نسب حضرت حسنؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ تک جا پہنچتا ہے۔[12]

تعلیم

چار سال کی عمر میں آپ ؒ کو مکتب داخل کروایا گیا۔ آپؒ کے برادر کبیر سید اسحٰق اور والد بزرگوار کو آپؒ کی تعلیم کی بڑی فکر تھی لیکن یہ امر تعجب خیز تھا کہ آپ ؒ کی توجہ تعلیم کی طرف نہ تھی۔ تین سال کے عرصے میں قرآن پاک کی چند سورتیں اور چند ایک الفاظ لکھنا سیکھے۔ آپؒ بچپن ہی سے مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں مثلاً کبڈی وغیرہ میں ذوق شوق سے حصہ لیتے[13] ۔ ایک کھیل عجب تھا جو صرف آپ ہی کھیلا کرتے تھے وہ یہ کہ آپ اکثر اوقات بچوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ۔ ایک گروہ دوسرے کے قلعہ پر حملہ کرتا اور اسے فتح کرتا[14] ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ طفلی میں بھی اللہ رب العزت کے یہاں سے آپ کی مجاہدانہ تربیت جاری تھی۔

کسبِ معاش اور سفر دہلی

سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں آپؒ نے کسب معاش کی غرض سے لکھنو کا سفر کیا اور پھر وہاں سے دہلی کوچ کیا اور شاہ عبد العزیزؒ کے سامنے دو زانو ہوئے۔ شاہ صاحبؒ نے آپ کو گلے سے لگایا اور آپؒ کے آباء

کی نسبت بڑی بڑی آؤ بھگت کی اور آپ کا ہاتھ شاہ عبد القادرؒ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ اس مہمان کی قدر کرنا اور خدمت میں کسی قسم کی کو تاہی نہ کریں۔ آپؒ اکبری مسجد میں شاہ عبد القادرؒ کے ہاں مقیم ہوگئے اور بعد میں شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت ہوئے[15]۔ آپ نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ بعض کتابیں شاہ عبد القادرؒ اور بعض شاہ عبد العزیزؒ سے شروع کیں لیکن جلد ہی یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ باوجودیکہ آپ نے مکمل تعلیم حاصل نہ کی لیکن ہندوستان کے مرکزِ فیض و رشد و ہدایت ،شاہ عبد العزیزؒ کے مجلسِ شریعت نے آپ کو وہ کچھ سکھا ڈالا جو برسوں کی محنت شاقہ کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔[16]

ازدواجی زندگی کا آغاز

دہلی میں طویل عرصہ قیام کے بعد رائے بریلی کو واپسی ہوئی۔ گھر سے سن بلوغت میں نکلے تو چہرہ بالکل صاف تھا اب جو واپسی ہوئی تو گھنی داڑھی تھی۔ رشتہ داروں نے پہچاننے سے انکار کر دیا لیکن سید عبد القادر خانؒ نے آپؒ کو پہچان لیا اسی مدت میں آپ ؒ کی شادی سید محمد روشن کی صاحبزادی سے ہوئی اور ۱۲۳۴ھ میں آپ کی بڑی صاحبزادی بی بی سارہ پیدا ہوئیں ۔

دہلی کا دوسرا سفر اور نواب امیر خان کی وفات

۱۳۲۶ھ میں آپؒ نے دہلی کا دوسرا سفر کیا۔اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مقصد کے لئے آپ کو پیدا کیا تھا اس کی تیاری تو بچپن سے جاری تھی مگر مشیت ایزدی میں ابھی مزید قربت درکار تھی۔ اس لئے کہ سب کچھ سیکھ لینے کے بعد جب تک عملی طور اس کی مشق نہ ہو،مقصد پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا، گو کہ آپ بچپن سے ہی سپاہیانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے مگر میدان جنگ کے نشیب فراز، پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا یہ مراحل ہنوز تشنۂ تکمیل تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؒ کو کندن کرنے کے لئے نواب امیر خان کی رفاقت میں بھیج دیا جو اپنے وقت میں ایک آزاد فوجی طاقت تھی۔ باقی نظام حیدر آباد اور سلطنت اودھ تو شروع ہی سے انگریز کی سرپرستی قبول کر چکے تھے لہٰذا اس فوجی طاقت سے امید کی جاسکتی تھی کی یہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ امیر خان ،دلیر، نڈر، جفاکش اور اولو العزم فاتحین میں سے ایک تھا جس کی زندگی رزم آرائیوں اور جنگ آزمائیوں میں گزری تھی۔آپؒ نے امیر خان کی فوج میں شامل ہوتے ہی جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ استاذ الاساتذہ دنگ رہ گئے۔ آپ دو دو، تین تین گھنٹے ورزش کرتے۔ ڈنٹ لگاتے، مگدر گھماتے، تیراکی کرتے اور پانی میں ٹھہرنے کی مشق کرے یہاں تک کہ والئی ٹونک آپ ؒ کی بڑی تعریف کرتے۔ مولوی علیم اللہ جو تیراکوں کے استاد تھے، کہتے ہیں کہ یہ سید صاحب کا ہی وصف تھا کہ سخت بہاؤ میں بھی بہاؤ کے خلاف تیرتے تھے۔[17] شروع شروع میں جس وقت

آپؒ نے لشکر میں شمولیت اختیار کی، آپ کو کوئی نہ جانتا تھا مگر آہستہ آہستہ سپاہ پر یہ راز عیاں ہوتا گیا کہ یہ مردِ درویش تو بڑا ہی نیک، عابد، متقی اور مستجاب ا لدعوات ہے۔ سپاہی دعا کروانے کے لئے آپؒ کے پاس آتے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کی دعائیں قبول ہوتیں۔ آپؒ چالیس چالیس ہزار کے لشکر میں وہی اپنا سابقہ مشن جاری رکھتے۔ لوگوں کو توبہ تائب کرواتے اور امر با المعروف و نہی عن ا لمنکر کا فریضہ سرانجام دیتے[18]۔ آپؒ نے نواب امیر خان کی رفاقت میں ایک عرصہ گزارا۔ لشکر کی یہ رفاقت آپ کے لئے کانٹوں کی سیج تھی۔ یہ لشکر کبھی مالوے میں ہوتا تو کبھی راجپوتانہ میں، مارواڑ میں ہو تا تو کبھی میواڑ میں۔ سردی گرمی، بارش دھوپ، جنگل یا ریگستان، سر سبز اور بے آب و گیاہ وادیاں ہر طرح کے حالات سے پل پل واسطہ پڑتا اور آپؒ ہمہ وقت لشکر کے ہمراہ ہوتے اور صف اول میں داد شجاعت دیتے۔ آپ ؒخطرناک حالات میں نہایت صائب مشورہ دیتے اوراللہ تعالیٰ ان کو فتح سے ہمکنار فرماتے۔ اسی طرح کرتے کرتے چھ سال بیت گئے۔ نواب امیر خان کے نہ صرف مسلمانوں بلکہ مرہٹہ سرداروں اور راجپوت رئیسوں سے بھی تعلقات تھے لیکن نواب کی پوری زندگی انگریزوں کے خلاف جہاد سے ساتھ عبارت تھی۔ انگریزوں نے اس مردِ آہن کو کئی مرتبہ خریدنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ ایک مرتبہ جنرل لیک نے وسیع و عریض علاقہ اور تیرہ لاکھ کی پیشکش کی اور اس کے بدلے خاموشی سے بیٹھ جانے کا کہا تو نواب نے کہا میرا عزم تمام ہندوستان پر قبضہ کرنا ہے۔ اتنا سا ملک اور حقیر رقم لے کر کیونکر راضی ہوجاؤں؟ وہ انگریزوں کو نکالنے پر رنجیت سنگھ اور والی کابل شاہ شجاع تک کو ساتھ ملانے کے لئے تیار تھے ۔ ۱۲۳۲ ھ میں نواب اعزاء اقرباء رہائی کے لئے مادھو پور راجپورہ کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کہ ایک لاکھ بیس ہزار کی انگریز فوج نے بھاری توپخانے اور جدید اسلحے کے ساتھ آپ ؒ کا گھیراؤ کر لیا۔ نواب کا رابطہ اپنے معتبر دوستوں سندھیا اور راؤ ہلکر سے کٹ گیا۔ دوسرے یہ کہ ہر دور کی طرح میر جعفر و صادق آپ ؒ کے لشکر کی بغل سے بھی نمودار ہوئے اور آپ کا ؒ قدیم ساتھی ،رسالے دار فیض اللہ بنگش انگریزوں سے مل گیا۔ ان نازک حالات مین نواب کو خطرہ ہوا کہ کہیں میرے معتمدین مجھے طشتری میں رکھ کر انگریز کے حوالے نہ کردیں لہٰذا ہمت جواب دے گئی اور صلح پر آمادگی ظاہر کر دی۔ ۹ نومبر ۱۸۱۷ ء کو معاہدے پر دستخط ہوئے اور ۱۵ نومبر کو گورنر جنرل نے اس پر دستخط کر دیئے۔ سید احمد شہیدؒ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؒ نے ہر چند جنگ کرنے کا مشورہ دیا اس لئے کہ آپ سمجھتے تھے کہ نواب ہندوستان کی واحد آزاد اور با ہمت طاقت تھے لیکن جس وقت آپ کو معلوم ہو ا کہ نواب کے قویٰ جواب دے چکے ہیں تو آپ نے لشکر سے مفارقت کا فیصلہ کیا۔ نواب امیر خان نے حتی الو سع کوشش کی کہ یہ گوہر نایاب ہاتھ سے نہ جانے پائے

لیکن برصغیر پاک و ہند پر غلبہ اسلام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عزم رکھنے والے سید احمدؒ کے لئے یہ کب قابل قبول تھا کہ دشمن اسلام سے مصالحت کرکے ڈیڑھ اینٹ کی ریاست پر اکتفاء کر لیا جائے لہٰذا نواب سے معذرت کی اور دہلی روانہ ہو گئے۔[19]

دہلی میں تشریف آوری

نواب امیر خان کی علیحدگی کے بعد سید صاحب ؒ دہلی پہنچے اور یہ آپ ؒ کا دہلی کا تیسرا سفر تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ ؒ کی خداد صلاحیتیں کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ آپؒ تصوف وسلوک، ریاضت ومجاہدے میں یکتائے روزگار تھے۔ نواب امیر خان کے پاس ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد آپؒ خطہ ہند کے نشیب و فراز سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور اندازہ کر چکے تھے کہ وطن عزیز کی ناؤ جن بھیانک حالات سے دوچار ہے اگر اسے پوری قوت سے نہ سنبھالا گیا تو یہ کبھی بھی پار نہ لگے گی لہٰذا آپؒ نے ۸۰۰ سال تک ہند پر حکمرانی کرنے والے مسلمانوں کی سیاسی بقاء اور تجدید واحیائے ملت کے لئے عزمِ مصمم کیا۔[20]

شاہ عبدالعزیز کا خواب

سید صاحب کی دہلی آمد سے قبل شاہ عبد العزیز ؒ نے ایک خواب دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ دہلی کی جامع مسجد میں تشریف فرما ہیں اور پورے جہاں سے خلقت آپ ﷺ کے دیدار کے لئے چلی آ رہی ہے لیکن حضور اکرم ﷺ نے سب سے پہلے شاہ صاحب کو دست بوسی سے نوازا اور پھر ایک عصا دیکر فرمایا کہ تم مسجد کے دروازے پر بیٹھ رہو۔ جس کے لئے ہمارے در سے اجازت ملے، اسے اندر آنے دو۔ شاہ عبد العزیز محدثؒ نے خواب شاہ غلام علیؒ کو سنایا تو انہوں نے اس کی یہ تعبیر بتائی کہ رسول ﷺ کے فیض ہدایت کا سلسلہ آپ یا آپ کے کسی مرید سے جاری ہو گا۔[21]

مبحث سوم: سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی خدمات اور محققانہ تجزیہ

سید احمد شہیدؒ وہ شخصیت تھے جنہوں نے تیرہویں صدی میں مسلم امہ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عہد زوال میں اصلاح امت کا فریضہ سرانجام دیا اور اس کی بنیاد ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ[22] پر رکھی۔ آپ ﷺ نے مکی زندگی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے اسی فریضے کو سرانجام دیا۔ حضرت سیدؒ جو کہ غلبہء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا عزم رکھتے تھے، ان کے لئے ضروری تھا کہ سب سے قبل مسلمانوں کی ایمانی حالت کو

درست کر کے ان کی اصلاح کی جائے۔اس مقصد کے لئے آپ نے وادی ہند کے مختلف مقامات کے تبلیغی دورے فرمائے اور اس کام کا آغاز سنت رسول ﷺ سے کیا۔

سنت نبوی سے اصلاح و تجدید کا آغاز

سید صاحبؒ کے دل میں بدعات وخرافات کے خاتمے،جذبہ جہاد کے احیاء اور خالصتاً احیائے کلمۃ اللہ کے لئے اسلامی حکومت کے قیام کی تڑپ تھی۔اس مقصد کے لئے آپؒ نے اپنی تحریک کا آغاز سنت نبویہ کے مطابق بیعت لینے سے کیا۔سب سے پہلے مولوی محمد یوسف پھلتیؒ نے اپنا ہاتھ آپ ؒ کے دست مبارک میں دے کر مرتے دم تک عہد وفا کیا اور پھر اس کو ہر موقع پر ثابت بھی کرکے دکھایا۔واضح رہے کہ مولوی محمد یوسفؒ، شاہ ولی اللہ ؒ کے برادر شاہ اہل اللہ ؒ کے پوتے تھے۔اس کے بعد مولانا عبد الحیٔ آپؒ کے سامنے دو زانو ہوئے اور پھر شاہ اسماعیل ؒو شاہ اسحاقؒ بھی اس شجر سایہ دار کے اسیر ہوگئے۔شاہ اسماعیل جو کہ آپؒ کے دست راست اور نہایت معتمد تھے،شاہ ولی اللہ ؒ کے بھتیجے اور شاہ اسحاق ؒ کے نواسے تھے۔آپؒ تحدیثِ نعمت کے طور پر اکثر یہ آیت پڑھا کرتے تھے[23] **الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ**[24]۔ شاید یہ بھی عطائے خداوندی تھی کہ عظیم مقصد اور عظیم مہم کے لئے عظیم لوگ ہی درکار تھے۔واقعتاً یہ رب العالمین کی خصوصی عطا تھی جس نے خاندانِ ولی اللہؒ کو آپؒ کے اردگرد پروانوں کی مثل جمع کر دیا تھا۔

دوآبے کا سفر اور اصلاحات

خانوادہ ولی اللہ اور دیگر اکابرِدین کی بیعت نے پورے علاقے میں آپؒ کی دھوم مچا دی اور لوگ پھلت،بڑھانہ اور آس پاس کے اضلاع نیز دور دراز سے سفرطے کر کے دہلی پہنچنے لگے۔یہی زمانہ تھا جب لوگوں کے خطوط آنا شروع ہوئے کہ سب لوگ خدمت میں حاضری نہیں دے سکتے،آپ عنایت فرما کر خود تشریف لائیں تاکہ خلقِ خدا آپ کی بیعت سے سرفراز ہوسکے۔یہ خطوط چونکہ زیادہ تر میرٹھ،مظفر نگر اور سہارنپور سے آئے تھے اس لیے آپؒ نے وہاں جانے کا ارادہ کیا لیکن اوّلاً شاہ عبد العزیز ؒ سے اجازت چاہی جو انہوں نے مرحمت فرمائی۔رخصت کے وقت سفید رنگ کا خاص لباس پہنا اور سیاہ دستار سر پر رکھی اورگنگا وجمنا کے درمیانی علاقے دوآبے کا دورہ شروع کیا۔کم وبیش بیس آدمی آپ کے ہمراہ تھے،موسم سردیوں کا تھا۔غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق آپؒ نے نومبر ۱۸۱۸ء میں دہلی سے سفر شروع کیا اور مئی میں واپس پہنچے۔وقائع احمدی کے مطابق آپؒ ۱۲۳۴ھ میں سہارن پور میں تھے۔پورے دورے میں آپؒ

کو بے پناہ پذیرائی ملی۔ دہلی سے چل کر پہلی منزل غازی الدین نگر ہوئی جہاں عمائدینِ شہر سمیت ۲۰۰ آدمیوں نے آپ کا استقبال کیا[25]۔پانچ روز تک لوگوں کا وہ ہجوم رہا کہ پل بھر آپ کو فرصت نہ مل سکی۔ تحصیلدار ہری رام کشمیری جمِ غفیر سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ رقم ہدیۃً حضرت سیدؒ کے حوالے کی۔مرادنگر میں مفتی الہیٰ بخش کے صاحبزادے مولوی ابو القاسم جو وہاں کے تھانیدار تھے،استقبال کے لئے آئے اور بمع عملہ بیعت ہوئے۔میرٹھ کے قاضی احمداللہ نے پچاس آدمیوں کے ساتھ استقبال کیا۔میاں خدا بخش نے اپنے گھر پر پورے قافلے کی دعوت کی اور اپنے اعزاء واقارب ،متعلقین اور عملے کے ساتھ بیعت سے مشرف ہوا۔ایک برہمن میاں صاحب کے تمام کاروبار کا مختار اور ان کے مزاج میں دخیل تھا۔حضرت سیدؒ کی بیعت کے بعد اس کا طلسم ٹوٹ گیا۔گانے بجانے کے تمام آلات اور اس کے تمام متعلقات باہر کر دیئے گئے۔اس کے کچھ عرصے بعد برہمن خود مسلمان ہوگیا۔اہل میرٹھ نے نہ صرف آپ کی بیعت کی بلکہ بڑھ چڑھ کر ضیافتیں بھی کیں ۔بیش بہا قیمتی تحائف آپ کی خدمت میں پیش کئے اور جب آپؒ وہاں سے روانہ ہوئے تو اصحاب ِمیرٹھ فرط محبت سے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور زار وقطار روئے[26]۔اس کے بعد موضع داتل، پائلی اور کھردی سے ہوتے ہوئے سردہنہ اور وہاں سے بڈھانہ پہنچے جہاں آپ کے رفیقِ خاص مولانا عبدالحئیؒ کا آبائی گھر تھا۔یہاں بارہ روز قیام رہا اور کھانے کا بندوبست مولانا عبدالحئیؒ کرتے رہے۔اس عرصے میں بے شمار مرد و زن بیعت سے مشرف ہوئے۔

سہارنپور

سہارنپور میں قصابوں کی برادری تھی جن کی اکثریت آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپؒ سے بیعت کی لیکن ان کی ہیئت ہندوؤں کی سی تھی ۔مونچھیں بڑھی ہوئیں، لِٹیں رکھی ہوئیں اور لنگوٹ کسے ہوئے جن سے صرف شرم گاہ ہی چھپ پاتی تھی۔آپؒ نے ان کو تلقین کی کہ مونچھیں ترشواؤ، لِٹیں رکھنا چھوڑو اور لنگوٹ کی جگہ پاجامہ پہنو نیز پانچ وقت نماز ادا کرو۔انہوں نے سب باتیں قبول کیں۔تعلیم و تعلم کے لئے حافظ قطب الدین مقرر ہوئے۔دو، تین دن میں، تین تین سو آدمیوں نے مونچھیں کٹوا دیں اور اپنے حلیے درست کر لئے۔مولانا عبدالحئیؒ نے شرک وبدعت پر درس دیا اور ہر ایک چیز کی قباحت کو خوب خوب بیان کیا تو قصاب بولے کہ ہمیں آج سے قبل اس کا بالکل بھی علم نہ تھا اور ہم تو اس کو دین سمجھتے تھے لہٰذا آئندہ کے لئے توبہ کرتے ہیں۔مستورات بھی نماز پر کاربند ہوئیں اور اپنے مردوں سے بولیں کہ جب تک تم بیعت نہیں ہوں گے ،گھر میں نہ گھسنے دیں گی، اس پر وہ بھی بیعت ہوئے[27]۔

دیوبند،نانوتہ

دیوبند میں قیام کے دوران مولوی شمس الدین صاحب جنہیں آپؒ کے بارے میں بداعتقادی اور سوءِ ظن تھا، غیبی ہدایت کے ذریعے آپ سے مشرف بہ بیعت ہوئے اور تمام خلاف شرع کاموں سے توبہ کی۔ بیعت سے پہلے گنڈہ اور عملیات وغیرہ کے جو کام کیے تھے، اہل معاملہ کے پاس جا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اپنی غلطی کو معاف کروایا۔ دس دن دیوبند میں قیام رہا لوگوں نے جوق در جوق بیعت کی۔[28] نانوتہ میں جامع مسجد میں قیام کیا۔ بیعت لینے والوں کا جمِ غفیر اس قدر تھا کہ آپؒ کو اپنی دستار اتارنا پڑی۔ ایک سرا اپنے ہاتھ میں رکھا تو دوسرے سرے تک ان گنت طالبانِ فیض نے اسے تھام لیا اور بیعت کی[29]۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تحقیق کے مطابق دوآبے کا یہ سفر ۱۲۳۳ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۳۴ھ کی محرم کا چاند آپ نے سہارنپور میں ہی دیکھا اور پھر مضافات سے ہوتے ہوئے آپ کا آخری قیام کاندھلہ میں ہوا اور دہلی کی جانب مراجعت کی۔ تاریخ کی تعیین مشکل ہے لیکن ندویؒ کی تحقیق کے مطابق جمادی الاولیٰ تک واپسی ضرور ہوئی اور اس کے بعد دو اڑھائی ماہ دہلی میں قیام کے بعد اپنے وطن رائے بریلی کا قصد فرمایا۔

دہلی سے رائے بریلی کو واپسی اور مضافات کا تبلیغی دورہ

گھر سے ایک طویل عرصہ دور رہنے کے بعد آپ کو وطن جانے کی خواہش ہوئی تو رائے بریلی کا قصد فرمایا اور شنبہ کے روز پچاس ساتھیوں کے ہمراہ جانبِ سفر ہوئے۔ آپ کا پہلا قیام غازی پور ہوا جہاں آپ کو برادر معظم سید اسحٰق کی وفات کی خبر ملی تو غم کے مارے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ اس کے بعد ہاپوڑ، گڑھ مکتیسر، امروہہ اور رام پور سے ہوتے ہوئے ۲۹ شعبان ۱۲۳۴ھ کو رائے بریلی پہنچے۔ رائے بریلی کے قیام کے دوران آپؒ نے ایک تبلیغی دورہ فرمایا جو کہ رائے بریلی سے مشرق کی جانب سلون، ابلاد گنج، الہ آباد، بنارس وغیرہ کی طرف تھا۔ رائے بریلی سے پہلی منزل سلون ہوئی جہاں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی ایک مشہور خانقاہ ہے۔ پیر شاہ محمد ؒ کے ہاں جو کہ شاہ عبد الکریم مانکپوریؒ کے ممتاز خلیفہ اور شاہ علم اللہؒ کے معاصر تھے، ان کے ہاں قیام فرمایا۔ اس کے بعد اگلی منزل ابلاد گنج ہوئی جہاں والئی لکھنو کے عامل کاظم بیگ اپنے رفقاء کے ہمراہ آپ سے بیعت ہوئے۔ الہ آباد میں آپ کا قیام پیرزادوں کے پاس ہوا۔ راجہ اودت کے عامل شیخ غلام علی آپ سے ایسے بیعت ہوئے کہ سابقہ زندگی سے توبہ کی اور تمام مصنوعات، سونے، چاندی کے برتن اور لہو و لعب کے آلات کو تڑوا ڈالا اور پھر جلادیا، ان کو بیچنا بھی پسند نہ کیا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں شرفاء نے بیعت کی اور آپ کے ہاتھ پر توبہ تائب ہوئے۔ اس کے بعد اپ کا قیام بنارس اور سلطانپور ہوا جہاں حاکم لکھنؤ کی جانب سے ناظم شہر غلام حسین آپ سے بیعت ہوئے۔ مولوی سید علی، جو اس سفر میں

آ کے ہمراہ تھے، کہتے ہیں کہ بنارس و الہ آباد میں دس سے پندرہ ہزار افراد آپ سے بیعت ہوئے[30]۔ لکھنؤ میں قیام کے دوراں صبح سے شام اور شام سے صبح ہوجاتی، لیکن فرزندانِ توحید کا تانتا بندھا رہتا۔ مولانا عبدالحی نماز جمعہ پڑھاتے تو مسجد میں ازدھام ہوجاتا۔ وعظ کے بعد سوالات کا سلسہ شروع ہوتا تو عشاء وہیں ہوجاتی[31]۔

مختصر یہ کہ آپؒ اور آپؒ کے رفقاء بارگاہِ خداوندی کے وہ چنیدہ اشخاص تھے جن کے ہاتھوں میں رب العالمین نے ہدایت مقدر کر دی تھی۔ یہ بندگانِ خدا جہاں سے گزرتے، دل کی اجڑی اور ویران بستیوں کو یادِ خداوندی سے آباد کرتے چلے جاتے۔ امیر و غریب، ملازم و مزدور، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب آپ سے دست بدست ہوتے چلے جاتے۔ یہ دراصل اس خلوص کا اثر تھا جس نے سید احمد شہیدؒ کے دل میں دینِ محمدی ﷺ کے احیاء کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ یہ خلوص اس قدر اہم ہے کہ ایک پوری سورت اخلاص کے نام پر توحیدِ خداوندی کے پرچار کا درس دیتی ہے۔

حضرت سید ؒ کا وجود اہل ہند کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا جہاں خانقاہ اور جہاد دونوں جمع ہوگئے تھے۔ وہاں جو افراد زانوائے تلمذ طے کرتے وہ تزکیہ و مراقبہ کی دولت بھی سمیٹتے اور عملی جہاد کی مشق بھی کرتے۔ علاوہ ازیں یکتائے روزگار علماء کی صحبت بھی میسر تھی جن میں مولانا محمد اسماعیلؒ، مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد یوسف پھلتیؒ، حاجی عبد الرحیم ولایتیؒ، شاہ ابو سعید مجددیؒ شامل تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے ہاتھوں اصلاح و تجدید کے وہ کارنامے سرانجام دلوائے جن کے بارے میں سوچنا اس دور میں محال تھا۔

بیوہ عورتوں سے نکاح

اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے ہر حال میں عورت کو عزت کا تاج پہنایا ہے۔ ماں کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے قدموں تلے جنت ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ**[32] بیٹی کے بارے میں یہ بشارت دی گئی کہ جو تین بیٹیوں کی پرورش کرے گا تو یہ بیٹیاں اس کے لئے جہنم کی رکاوٹ ثابت ہوں گی۔ عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **مَنْ كَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ فَصَبَرَ عَلَيْهِنَّ، وَأَطْعَمَهُنَّ، وَسَقَاهُنَّ، وَكَسَاهُنَّ مِنْ جِدَتِهِ كُنَّ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ** [33] بیوی کے بارے میں کہا گیا کہ جو اس کے ساتھ بہتر ہو، وہ سب سے بہتر ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي**۔[34] اگر ان میں سے کسی کا خاوند نہ رہے تو اس سے شادی کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے گیارہ شادیاں فرمائیں لیکن ماسوائے سیدہ عائشہؓ کے تمام بیوہ تھیں یا مطلقہ بیوہ، لیکن تیرہویں صدی کے عہد زوال میں مسلمانوں

نے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہ کر ان کی رسمیں اختیار کر لی تھیں جن میں سے ایک بیوگان سے نکاح نہ کرنا تھا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے تک یہ رسم نہ آئی تھی۔اکبر نے بیرم خان کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم سے نکاح کیا۔ جہانگیر نے نور جہاں بیگم سے بحالت بیوگی نکاح کیا جبکہ اس کی عمر ۳۴ برس تھی ۔لیکن اب بیوہ سے نکاح رؤساء و غرباء سب کے ہاں سخت معیوب تھا۔[35] مسلمان اس بری رسم کا اس طرح سے شکار تھے کہ علماء تک اس قبیح رسم کی حمایت میں دلائل دیتے۔ اس زمانے میں جب ایک استفتاء اس حوالے سے ایک عالم کے پاس آیا تو اس نے بری رسم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور قرآن و حدیث سے ثابت کر دیا کہ ان حالات میں مسلمانوں پر رسم و عادت کی پیروی کرنے میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ بعض حالات میں عرف شرع پر مقدم ہے۔ اور بیوہ عورتوں کو فضیلت سنائی کہ اگر وہ بے عزتی اور غیرت کی وجہ سے دوسرا نکاح نہیں کریں گی تو انہیں ازواج مطہرات کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ثواب ملے گا۔ سید صاحب اس رسمِ بد کا خاتمہ چاہتے تھے۔ جس کا اعلان سادات کے گھرانہ سے ضروری تھا۔ آپ کے مرحوم بھائی سید اسحاق کی بیوہ، سیدہ ولیہ گھر میں موجود تھیں اور صرف ایک چھ یا سات سالہ بچہ آپ کے ہاں تھا۔ حضرت سیدؒ اس سنت کا اجراء اپنے گھر سے چاہتے تھے لہٰذا حکمت و بصیرت کو شعار بناتے ہوئے پیغام نکاح دینے سے پہلے اس ہندوانہ رسم کے خاتمے پر اپنے خاندان کے سامنے وعظ فرمایا۔ اُس رسم کا خاتمہ چونکہ نبی ﷺ نے اپنے گھرانے سے کیا تھا تو سید صاحبؒ نے بھی اِس رسم کے خاتمے کا آغاز اپنے گھر سے ہی کیا۔

سلام کا رواج

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے جب کوئی شخص کسی سے ملے یا مجلس میں جائے تو سلام کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا، وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا، ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ [36]۔ نبی کریم ﷺ نے زیادہ سے زیادہ سلام کو پھیلانے کا حکم دیا[37]۔ اور اس سلسلے میں یہ حکم دیا کہ: وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ [38] خواہ تمہاری کسی سے پہچان ہو یا نہ ہو، لیکن سلام ضرور کیا کرو۔ وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا [39] نے از حد بہتر سلام کا جواب دینے کو کہا۔ نبی کریم ﷺ نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے کی ترغیب دی[40] لیکن مسلمانان ہند چونکہ ایک طویل عرصے سے ہندوؤں کی معاشرت میں رہ رہے تھے لہٰذا اسلامِ مسنون قطعاً ختم ہو چکا تھا اور آداب و بندگی کا رواج تھا۔ یہ رسم اس قدر عام ہو چکی تھی کہ بعض اونچے گھرانوں میں شرعی سلام کو مجلس کے آداب کے منافی سمجھا جاتا تھا[41]۔ اگر کوئی چھوٹا اپنے سے بڑے شخص کو السلام علیکم کہتا تو وہ اسے اپنی ہتکِ عزت سمجھتا[42]۔ آپؒ نے اس سنت کا بھی اجراء کیا اور ہر موقع پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے الفاظ ہی سلام کے اجزاء قرار پائے۔ آپؒ جب شاہ

عبد العزیزؒ کے ہاں تشریف لے گئے اور مسنون سلام کے الفاظ ادا کئے تو وہ بہت مسرور ہوئے[43]۔ آپؒ کے حلقہ ارادت میں جو لوگ شامل ہوتے گئے اور جیسے جیسے آپؒ کے افکار دوسروں تک پہنچتے گئے، سلامِ مسنون کی متروک سنت زندہ ہوتی گئی۔ حیدر آباد کے فرمانروا نواب نصیر الدولہ کے بھائی نواب مبارز الدولہ نے جب آپؒ کی کتاب صراطِ مستقیم اور شاہ اسماعیلؒ کی کتاب تقویۃ الایمان پڑھی تو دربار میں حکم جاری کیا کہ آئندہ السلام علیکم کے الفاظ سے سلام کیا جائے[44]۔

زیور کی ممانعت

شریعت مطہرہ نے مرد و زن کے لباس اور ہر قسم کے پہناوے کی تفریق کی ہے۔ ریشم کے لباس اس دنیا میں عورتوں جب کہ آخرت میں مردوں کے لئے ہیں[45]۔ سونے چاندی کے زیورات بھی انہی کو زیبا ہیں، مردوں کو اس کی اجازت نہیں۔ ارشاد نبوی ہے: **أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيرُ لِإِنَاثِ أُمَّتِي، وَحُرِّمَ عَلَى ذُكُورِهَا**[46] حضرت سیدؒ جب کاندھلہ تشریف لے گئے تو مولوی ابو الحسن کے صاحبزادے ان کے ہمراہ تھے جن کی عمر آٹھ دس برس تھی اور زیور زیب تن کئے ہوئے تھے۔ آپؒ نے ان کی بابت پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ مولوی ابو الحسن نے بتایا کہ میرے صاحبزادے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ انہوں نے یہ کیا پہن رکھا ہے؟ کیا یہ جائز ہے؟ پھر اس پر ایسا وعظ فرمایا کہ انہوں نے فوراً زیور تڑوا ڈالا۔[47]

درسِ مساوات

رام پور سے بریلی کے سفر میں نواب بریلی آپ کی زیارت کے لئے جامع مسجد آئے اور آپؒ کو اپنے ہمراہ مکان پر لے گئے۔ نواب صاحب کے دیوان کے سامنے چند قبریں تھیں۔ آپؒ نے استفسار فرمایا کہ یہ قبریں کس کی ہیں؟ نواب صاحب نے عرض کیا کہ ہمارے گھرانے کے لوگ اس جگہ مدفون ہیں۔ آپ وہاں چل کر ان کے لئے دعا فرما دیجئے۔ آپؒ نے فرمایا آج نہیں کل۔ کل ہمارے پاس آیئے گا۔ پہلے شہر کے قبرستان میں جا کر غرباء کے لئے دعا کریں گے پھر آپ کے آباؤاجداد کے لئے۔ نواب صاحب نے اسے قبول فرمایا اور آپ کے ہاتھ پر بمع اہل و عیال بیعت کی۔ دوسرے دن پہلے شہر کے قبرستان میں دعا ہوئی پھر اس کے بعد نواب صاحب کے بزرگوں کے لئے دعا کروائی گئی۔[48]

غیر مسلموں کا مسلمان ہونا

حاجی شیخ احمد کہتے ہیں کہ میری عمر نو سال کی تھی تب میں ہندو تھا کہ حضرت سید احمدؒ نے موضع جاٹکا میں ایک مرتبہ وعظ فرمایا جو میرے دل میں اتر گیا۔ میں حضرت سیدؒ کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ مجھے مسلمان کر دیجئے۔ آپؒ نے دستِ شفقت سر پر رکھا اور کلمہ پڑھا دیا پھر مولانا عبد الحئیؒ سے فرمایا کی اس

بچے کا نام رکھو۔ مولانا کی زبان سے کریم الدین نکلا۔ اہل شہر نے کہا کہ یہ نام نہ رکھیئے اس لئے کہ عمائدین شہر میں سے کئی کا نام یہی ہے اس پر آپؒ نے اپنا نام احمد رکھوایا اور مولانا عبدالحئیؒ سے فرمایا کہ جہالت کی چند باتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ لوگوں کے دلوں سے نہ نکلیں تو اندیشہ ہے کہ آخر میں دین و ایمان میں خلل نہ آجائے۔ اوّل یہ کہ جب کسی کا بچہ مر جائے تو وہ دوسرے بچے کا نام پہلے کے نام پر نہیں رکھتے کہ کہیں دوسرا بچہ بھی نہ مر جائے۔ دوم یہ کہ غریب مسلمان اپنے بچے کا نام رؤسا میں سے کسی کے نام پر نہیں رکھ سکتا۔ سوم یہ کہ امراء غرباء کی دعوت قبول نہیں کرتے اور اس کو ذلت محسوس کرتے ہیں۔ چہارم یہ کہ جو کھانا ہم پکاتے ہیں، بیچارے غریب نہیں پکا سکتے، اس سے ہمسری اور برابری ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحئیؒ نے اخوت و مساوات پر ایسی روانی، خوش الحانی وخوش بیانی سے وعظ فرمایا کہ ہر ایک کا دامن آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ وہ لوگ جنہوں نے کریم الدین نام کی مخالفت کی تھی، از سر نو آپؒ کی بیعت کی اور آپؒ کے ہاتھ پر توبہ تائب ہوئے[49]۔

کفارۂ گناہ کی اصلاح

حضرت مسیح کی آمد سے قبل یہود کئی گروہ میں بٹے ہوئے تھے جن میں سے ایک گروہ وہ تھا جو مذہبی رسوم اور خدمتِ ہیکل خوب بجالاتا لیکن تورات میں تحریف کرتا، اسے اللہ کی طرف منسوب کرکے خوب نذرانے وصول کرتا۔ جبکہ ان سے بھی زیادہ مقبول احبار اور رہبان تھے جو لوگوں کو پیسوں کے عوض جنت کے پروانے لکھ دیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس گروہ کی خوب مذمت بیان کی۔ ارشاد فرمایا: **فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ**[50]۔ قرآن حکیم نے انہی کو اربابا من دون اللہ[51] کہا۔ حضرت سیدؒ کے سفر بنارس کے دوران بھی کچھ ایسی کیفیات دیکھنے کو ملیں جہاں کندی گھر اور دھوبیوں کے بہت سے گھر آباد تھے جن کا مرکزِ فیض ایک پیر صاحب تھے۔ آبادی کی اکثریت ارکان اسلام سے بے بہرہ اور تارکِ صوم وصلوٰۃ تھی۔ اس پر مستزاد ایک بڑی خرابی جو یہاں موجود تھی وہ یہ کہ اہل علاقہ ششماہی طور پر نذر و نیاز پیر صاحب کے حوالے کرتے تھے اور پیر صاحب ان کے ترک صلوٰۃ کی بخشش کا پروانہ لکھ دیتے اور اگر وہ حقہ عادت یا نشے کی بنیاد پر روزے رکھنے سے بھی عاجز ہوتے تو ششماہی نقدی کے ساتھ مزید نقدی یا دو چار دعوتیں اس کا کفارہ کر دیتیں اور پیر صاحب ان کو معافی کا پروانہ دے دیتے۔ حضرت سیدؒ کو جب اس کا علم ہوا تو آپؒ نے پیر صاحب کو تنبیہ فرمائی۔ پیر صاحب نے روزگار کا عذر کیا تو آپ نے انہیں قرآن و حدیث کی تعلیمات پر غور و فکر

کی دعوت دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیر صاحب بنارس چھوڑ کر کہیں اور روانہ ہوگئے اور اہل علاقہ اپنے اس فعل سے توبہ تائب ہوئے اور حضرت سیدؒ سے بیعت کی[52]۔

فرض عبادات میں کوتاہی

کتاب ہدایت قرآن مجید میں فرض عبادات کی بڑی تلقین آئی ہے۔ نماز کو کامیابی کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هم فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔[53] دوسرے مقام پر یہ بتایا گیا کہ نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔[54] زکوٰۃ کی فرضیت بیسیوں جگہ آئی اور رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے عمال مقرر فرمائے۔ صدیق اکبرؓ نے منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا۔ حج اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ قرآن حکیم نے اس کی فرضیت کو اس طرح بیان کیا ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا [55]۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی فضیلت میں ارشاد فرمایا: مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ، وَلَمْ يَفْسُقْ، رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ [56] یعنی کہ جو حج رفث اور فسوق سے پاک ہو وہ انسان کو گناہوں سے ایسے پاک کر دیتا ہے جیسے کہ وہ پہلے دن کا بچہ ہو۔ عہدِ زوال اور ہندوانہ تہذیب کے سبب مسلمانوں کی مذہبی حالت اس قدر گر چکی تھی کہ نماز روزہ اور حج جیسے بنیادی فرائض سے نہ صرف یہ کہ پہلو تہی تھی بلکہ یہ جسارت حقارت اور تمسخر تک جا پہنچی تھی۔ اللہ اور محمد رسول اللہ کے نام لیواؤں کی جرأت بعض اوقات یہاں تک پہنچ جاتی کہ اگر کوئی شخص نماز کی دعوت دیتا تو کہتے: کہ نماز نہ تو کمپنی (ایسٹ انڈیا) کا حکم ہے اور نہ روزہ برٹش کونسل کا آئین۔ جونپور جیسے شہر کی مساجد میں صرف فجر اور مغرب کی اذان ہوتی تھی اور مسجد کی حیثیت ایک کمیونٹی سنٹر کی تھی۔ مولانا کرامت علی جونپوری حضرت سید صاحبؒ کے خلیفہ تھے، آپؒ نے اس فریضہ کے احیاء میں اپنے آپ کو لگا دیا تھا۔ ایک مرتبہ آپؒ فجر کی اذان و نماز کے لئے مسجد جا رہے تھے کہ آپؒ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن حضرت سیدؒ کے یہ خلیفہ اور آپؒ کے رفقاء نے اس مشن کو جوں کا توں جاری رکھا[57]۔ تیرہویں صدی وہ زمانہ ہے جب بہت سے امور دینیہ میں غفلت و کوتاہی تو تھی ہی سہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظری اور فکری بنیادوں پر بھی بڑی تبدیلی رو نما ہو چکی تھی ۔ حج جو کہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ علماء کی تاویلوں اور فقہی اعذار کا شکار تھا کہ چونکہ راستہ پر امن نہیں ہے اور درمیان میں سمندر بھی حائل ہے لہٰذا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[58] کے منافی ہے لہٰذا اہل ہند سے اس کی فرضیت ساقط ہے اور ایسا کرنے والا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا [59] کی مخالفت کرتا ہے۔ ان فقہی تاویلات کی بنیاد پر حج کی ادائیگی متروک ہو کر رہ گئی تھی یا نہ ہونے کے برابر تھی۔ حضرت سید ؒ کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے احیائے دین کے لئے منتخب فرمایا تھا لہٰذا آپ ؒ نے اس دینی تحریف کا برقت استیصال کیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے دین دار منشی خیر الدین نے ایک استفتاء تیار کرکے اس کا جواب مختلف

مفتیان سے طلب کیا۔ چند علماء نے حج کی عدم فرضیت کا فتویٰ دیالیکن تحریک سید احمد شہیدؒ کے نامور علماء مولاناعبدالحیؒ، مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اس کی فرضیت کو مدلل طریقے سے ثابت کیا۔ منشی خیرا لدین نے یہ فتوے شاہ عبدالعزیز کے پاس دہلی بھیج دیئے۔ آپ نے شاہ اسماعیلؒ و مولانا عبدالحیؒ کے فتوں پر مہر ثبت کی[60]۔

حج کاارادہ

حضرت سید ؒنے حج کی ادئیگی کا ارادہ فرمایا اور اپنے متعلقین کے پاس دہلی ، پھلت نگر، سہارنپور میں خطوط لکھوائے۔ یہ خطوط سید احمد علی کے صاحبزادے سید زین ا لعابدین نے لکھے جن کا مضمون یہ تھا کہ حج کی ادائیگی کے لئے ہمارا ارادہ بیت ا للہ کے سفر کا ہے، جو حج کرناچاہتا ہے وہ ہمارے ہاں تشریف لائے لیکن یاد رکھے نہ ہمارے پاس مال ہے نہ دولت، محض اللہ پر توکل ہے۔ یہ مضمون بڈھانہ میں مولانا عبدالحیؒ کو، دہلی میں شاہ اسماعیل ؒاور پھلت میں مولوی‌وحید الدینؒ کولکھے گئے۔

حضرت سیدؒ کی اس خط و کتابت نے ہندوستان کے مسلمانوں میں حج کی تحریک پیدا کر دی۔ برسوں سے ساقط‌ومتروک فریضہ حج کی ادائیگی کا وقت آیا۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ دیوانہ وار اپنی جائیدادیں بیچ کر اس فریضہ کے لئے نکلے۔ مولاناعبدالحیؒ اپنے قافلے سمیت آپ سے کانپور میں آ ملے ۔شاہ اسماعیل ؒکا خط آیا کہ ہمارے یہاں سے حکیم مغیث الدین، مولوی وحید الدین اور حافظ قطب الدین وغیرہ ڈھائی سو کا قافلہ لے کر گڑھ مکتیسر کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو چکے ہیں[61]۔ چالیس آدمی آپؒ کے اعزاء‌واقرباء میں سے حج کے لئے تیار ہو گئے[62]۔ آپ ؒبمعہ اپنے رفقاء شوال کی آخری تاریخ ۱۲۳۶ ھ کو چار سو آدمیوں کے ساتھ عازمِ حج ہوئے۔ روانگی کے وقت آپؒ نے اپنے خازن مولوی محمد یوسف پھلتی سے جن کے پاس تقریباً سو روپے تھے۔ اپنے ہاتھ سے رائے بریلی کے غرباء میں تقسیم فرمائے اور گڑگڑا کررب تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اے اللہ تو ہمارا حامی و ناصر ہو جا۔ آپؒ نے قافلے کے اراکین کو کشتیوں میں جمع کرکے وعظ فرمایا۔ توکل علی اللہ اور تقویٰ کی تلقین کی نیز فرمایا کہ کوئی شخص بھی کسی چیز کاسوال نہ کرے اگر ہمارے پاس زادِ راہ نہ ہوا تو ہم مزدوری کرکے کھائیں گے[63]۔

اخلاقی حالت کی درستگی

سید صاحبؒ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت کادیوالیہ نکل چکا تھا۔شراب نوشی کی وباعام تھی مگر آپؒ کے مواعظ اور آپؒ کے خلفاء کی کوششوں سے اس وباکوروک لگ گئی۔سفر ِحج کے دوران جب آپ کلکتہ پہنچے تومسلمانوں کے جم غفیر نے شراب سے توبہ کی۔شراب کے ٹھیکہ داروں نے متعلقہ افسر سے اپیل کی کہ اس مرتبہ ان سے شراب کا

ٹیکس نہ لیا جائے اس لئے کہ اس بار سید صاحبؒ کے کلکتہ آنے کے بعد مسلمانوں نے شراب سے ایسی توبہ کی ہے اب ان کی طرف کوئی رخ ہی نہیں کرتا[64]۔ حضرت سیدؒ کی دعوت وارشاد کی بدولت نہ صرف یہ کہ زنا کی لت میں مبتلا افراد نے توبہ کی بلکہ پیشہ ور خواتین نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس مکروہ دھندے کو اپنی زندگی سے باہر کر دیا اور پھر بقیہ زندگی اللہ کے لئے وقف کر دی۔ عظیم آباد کی ایک خاتون اپنی ایک لڑکی اور دو لڑکوں کے ہمراہ آئی اور اس مکروہ فعل سے توبہ کی۔ حضرت سیدؒ نے ان کو قافلہ حج میں شامل کیا۔ ایک مرتبہ سید صاحبؒ کا گزر ایک علاقے سے ہوا۔ آپ کے رفقاء بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک پیشہ ور خاتون کی جیسے ہی نظر پڑی تو اس کے دل کی حالت بدل گئی اور توبہ تائب کے لئے حاضر ہوئی۔ اِس وقت اس خاتون کے گھر میں نَو افراد ایسے موجود تھے جو اس کے شناسا تھے۔ وہ بھی تائب ہوئے۔ آپؒ نے ان میں سے ایک کی شادی اسی خاتون سے کروائی۔ یہ نو کے نو افراد سید صاحبؒ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے اور سب کے سب نے جامِ شہادت نوش کیا اور یہ خاتون ایک دوسری پیشہ ور خاتون، موتی، جو شاہ اسماعیلؒ کی دعوت پر توبہ تائب ہوئی تھی، کے ہمراہ فی سبیل اللہ کاموں میں حصہ لیتی تھی[65]۔

رزق اللہ تعالیٰ کی نعمت اور احسان ہے۔ ہندوانہ تہذیب کے زیرِ اثر مسلمان ایک دوسرے کے جوٹھے کو ناپاک سمجھتے تھے اور بچا ہوا کھانا پھینک دیا کرتے تھے۔ جن برتنوں میں کھانا کھاتے، کھانے کے بعد انہیں چھو نہ سکتے تھے۔ بعض علاقوں میں بکری کا گوشت کھاتے اور بکرے کے گوشت کو ناپاک سمجھتے۔ سید صاحبؒ نے اپنے خلفاء کو خصوصی ذمہ داری سونپ کر ان مکروہات کا خاتمہ کروایا۔

مذہب اسلام کی معاشرتی تعلیمات میں حیاء، عفت اور پاکدامنی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام اس مقصد کے حصول کے لئے نکاح کا پاکیزہ راستہ تجویز کرتا ہے لیکن اس میں افراط و تفریط کو روا نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کے عہدِ زوال میں یہ پاکیزہ رشتہ بھی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا تھا۔ بنگال و آسام کے علاقوں میں چار سے زیادہ شادیوں کا رواج تھا۔ بعض اوقات ایک عورت سے شادی ہوتی اور باقی عورتیں شادی کے بغیر ہی شادی جیسی زندگی گزارتیں اور ان سے ہونے والی اولاد کو بالکل بھی معیوب نہ سمجھا جاتا۔ بعض اوقات ایک شخص دو بہنوں سے شادی کر لیتا۔ یہ تمام افعالِ بد چونکہ سراسر احکاماتِ اسلام سے بغاوت کے عکاس ہیں لہٰذا حضرت سید اور ان کے رفقاء نے شب وروز کی محنت سے ان بے ضابطگیوں کے سامنے پُل باندھا۔ عوام تو عوام، امراء تک راہِ راست پر آئے۔ نواب حیدر آباد دکن کے بھائی نواب مبارز الدولہ نے اپنے حرم میں چار بیویاں رکھیں اور باقیوں کو چار دیواری سے رخصت کر کے نکاح کی اجازت دی[66]۔

سید احمدؒ کی تحریک کے وادیِ ہند پر اثرات

سید صاحب کی اصلاحی تحریک نے پاک و ہند کی دھرتی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ آپؒ کی تحریک کی مثال ابرِ رحمت کی سی تھی، جہاں سے گزر ہوا بے آب و گیاہ وادیاں سرسبز و شاداب بلکہ لالہ وزار بنتی

گئیں۔آپ کسی بھی واقعہ کا اعتبار عینی شاہدین سے کیا جاتا ہے ،روزِازل سے دنیا والوں کا قاعدہ یہی ہے۔جن لوگوں نے سید ؒ کی اس تحریک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ اسکا لب لباب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس تحریک کے قدم جہاں بھی پڑے وہاں شرک و بدعت کا خاتمہ ہو گیااور رسوم ورواج پر قفل چڑھ گئے۔ہندوانہ طرز معاشرت اور مشرکانہ بودوباش کی اصلاح ہوئی، دینی تعلیم پروان چڑھی، شراب نوشی اور برہنہ غسل جیسے منکرات پر پابندی لگی اور شرعی احکامات کانفاذ ہوا۔مساجد میں رونق آئی۔قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہوئیں، اور اتباع سنت کا جذبہ بیدار ہوا۔حج اور جہاد جیسے فریضے کا اجراء ہوا۔ شیخ الھندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدؒ دیوبند، سہارنپور کے جن قصبہ جات میں تشریف لے گئے وہاں اب تک خیر و برکت ہے۔ مولانا ابو الحسن علی ندویؒ اپنے والد صاحب کے تاثرات نقل کرتے ہیں جنہوں نے ۱۳۱۲ھ میں دہلی وسہارنپور کے نواح کا سفر کیا، وہ فرماتے ہیں کہ سہارنپور کے جس قصبے میں بھی جانے کا اتفاق ہوا،انہیں حضرت سید ؒ کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ سب کا ایک ہی اتفاق تھا کہ ہم تو برائے نام مسلمان تھے ،اصل حقیقی اور سیدھی راہ ہمیں حضرت سیدؒ نے دکھائی۔ اس تحریک نے جو ایک چلتا پھرتا اجتماع تھا،دنوں میں وہ کام کر دکھایا جو برسوں کی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں آدمیوں نے آپؒ کی بیعت کی اور آپ کے ہاتھ پر توبہ تائب آئے۔ فسق وفجور کی زندگی کو ترک کیا اور متقی ومتورع ہو گئے۔ اس تحریک کا اثر نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں پر بھی پڑااور کتنے ہی ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

سفارشات

سید احمد شہیدؒ کی دائی حیات کے مطالعے کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1. علماء وسکالرز کو چاہئے کہ وہ عوام اور بالخصوص نسلِ نو کے ذہنوں میں سید احمد شہیدؒ جیسے مشاہیر کی زندگی اسوۂ رسول کی روشنی میں بطور ماڈل پیش کریں۔
2. مادی اسباب کے اختیار کرنے کے ساتھ اتھ تعلق مع اللہ کو اس طرح مضبوط کریں کہ نصرت خداوندی کا نزول ہو۔
3. فریضہ دین کی تبلیغ میں سنت رسول ﷺ پر مضبوطی سے کاربند رہیں۔
4. حالات جس قدر بھی گھمبیر ہوں، توکل علی اللہ کی بنیاد پر صدائے حق بلند کریں۔
5. سید احمد شہیدؒ کی حیات پر ایک سبق اسلامیات ومطالعہ پاکستان میں شامل کریں۔

حواشی و حوالہ جات

[1] نعیم صدیقی، پروفیسر، تاریخ عالم اسلام، دانیال بک پبلشر، لاہور، ص:947

[2] محولہ بالا

[3] ایضا، ص:953

[4] ایضا، ص:955

[5] ایضا، ص:992

[6] ندوی، ابوالحسن علی، سید، سیرت سید احمد شہید، خواجہ بک ڈپو، اردو بازار لاہور، 1958، طبع چہارم، ص:۱/۳۷-۳۸

[7] محولہ بالا

[8] ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، ص:۱/۴۰

[9] ایضا

[10] Nadvi, Syed Abul Hasan, Life of Syed Ahmed Shaheed, Translated by Qazi Abdul Hameed (Bhopal: Board of Islamic Studies), P.4

[11] حماد الکریمی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ نمبر 11، جلد نمبر، 11، نومبر، 2011

[12] وقائع احمدی، سید احمد شہید اکیڈمی، لاہور، ص:2-10

[13]. Nadvi, Syed Abul Hasan, Life of Syed Ahmed Shaheed, P.5

[14] ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، ص:۱۱۰

[15] وقائع احمدی، ص:16

[16] ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، ص:۱/۱۲۷

[17] ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، ص: ۱/۱۱۵

[18] وقائع احمدی، ص:33

[19] ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص:۱/ ۱۴۴-۱۴۶

[20] مہر، غلام رسول، سید احمد شہید، کتاب منزل لاہور، ص:۱/۱۱۳

[21] وقائع احمدی، ص:۱/۹۰

[22] سورۃ النحل:125

[23] مہر، غلام رسول، سیرت احمد شہید، ص:۱/۱۱۶

[24] سورۃ ابراہیم:39

[25] مہر، غلام رسول، سیرت احمد شہید، ص:1/ ۱۲۴-۱۲۵ نیز دیکھئے: ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص: ۱/۱۵۶

[26]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص: 1/ ۱۵۷

[27]ایضا، ص:۱/ ۱۵۶

[28]ایضا

[29]مہر، غلام رسول، سیرت احمد شہید، کتاب منزل لاہور، ص:۱/ ۱۲۶

[30]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص: ۱/ ۲۰۸،۱۹۹

[31]ایضا، ص: ۱/ ۲۰۴

[32]ابوعبداللہ محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی، مسند شہاب القضاعی، تحقیق: حمدی بن عبد المجید السلفی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۶، ۱/ ۱۰۲

[33]ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۶۶۹دار احیاء الکتب العربیہ، ۲/ ۱۲۲۰

[34]الترمذی، محمد بن عیسی، سنن الترمذی، حدیث نمبر:۳۸۹۵، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۵ء،، ۵/۷۰۹

[35]مہر، غلام رسول، سیرت احمد شہید، ۱/ ۱۴۳

[36]سورۃ النور:۳۸

[37]محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۳۵، دار طوق النجاۃ، 1422ھ، ۱/ ۵۲

[38]محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۲، ۱/ ۱۲

[39]سورۃ النساء:۸۶

[40]سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، المکتبۃ العصریہ، بیروت، حدیث نمبر:5185،، ۴/ ۳۴۷

[41]مہر، غلام رسول، تحریک سید احمد شہید، ۱/۱۱۴

[42]نشاط، ڈاکٹر عباد الرحمٰن، سید احمد شہید-شخصیت، تحریک اور افکار، سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۹۱

[43]ایضا، ص:۹۲

[44]ایضا، ص:۹۲

[45]صحیح بخاری، حدیث۵۴۲۶، صحیح مسلم، حدیث:۲۰۶۸

[46]سنن النسائی، حدیث: ۵۱۴۸، السنن الکبریٰ، حدیث ۴۲۲۰

[47]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص: ۱/ ۱۷۴

[48]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص، ۱/ ۱۸۰

[49]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص:۱/ ۱۷۲

[50]سورۃ البقرہ:79

[51]سورۃ التوبہ:31

[52]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، ص1/ ۱۹۰

[53]سورۃ المؤمنون:۱

[54]سورۃ العنکبوت:۴۵

[55]سورہ آل عمران:97

[56] صحیح بخاری، حدیث، 1521، ص، ۲/۱۳۳

[57]نشاط، ڈاکٹر عباد الرحمٰن، سید احمد شہید- شخصیت، تحریک اور اثرات، ص:۱۱۶-۱۱۷

[58]سورہ آل عمران:97

[59]سورۃ الطلاق:7

[60]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص ا/۲۵۲

[61]وقائع احمدی، ۲/۸۹

[62]ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید ص ا/۲۵۹

[63]وقائع احمدی، ۲/۹۹

[64]نشاط، ڈاکٹر عباد الرحمٰن، سید احمد شہید، شخصیت، تحریک اور اثرات، ص:۱۸۷

[65]ایضا، ص:۱۸۹

[66]ایضا، ص:۲۰۱